

جوابی بیانیوں کا پس و پیش

پچھلے چند ہفتوں میں علمی، سیاسی، سماجی اور بالخصوص مذہبی حلقوں میں استاذ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی کا جوابی بیانیہ گرمی بحث و مباحثہ رہا ہے۔ مجھے میرے بعض احباب نے لکھنے کو کہا، مگر میں نے انکار کر دیا تھا، کیونکہ اس وقت ایک طرف میرے استاذ گرامی ہیں، یہ ناچیز جو کچھ ہے، ان کے فیض تربیت سے ہے، اور دوسری طرف محترم تقی عثمانی صاحب ہیں، جو حلقہ دیوبند کے ایک مجتہد صفت عالم دین ہیں۔ میں دونوں کا احترام کرتا ہوں اور قلم اٹھانے کو خلاف آداب سمجھتا ہوں، اس لیے کہ ہماری مشرقی روایت ہمیں یہی سکھاتی ہے۔

لیکن اب بہت کچھ لکھا گیا ہے اور تقریباً ہر شعبہ زندگی کے لوگوں نے اپنے اپنے رشحات قلم سے مختلف فورمز پر صفحہ ہائے قرطاس و نیٹ کو مزین کیا ہے۔ اس بحث کے بارے میں کسی موقف کی تائید یا تردید میرے پیش نظر نہیں ہے، بلکہ چند اصولی مباحث چھیڑنا چاہتا ہوں تاکہ اس مسئلے کی نزاکت اور اس کے تاریخی جبر کو سمجھا جاسکے۔

پہلی بات: نقد کیسا ہو؟ میری نظر میں پچھلی چند صدیوں کا تنقیدی لٹریچر جو گزرا ہے، اس کے مطالعہ کی روشنی میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ افسوس اس بات پر ہے کہ جب ہمارا جید سے جید عالم، جس نے اپنی علمی وجاہت کو منوایا ہو، وہ بھی جب قلم اٹھاتا ہے تو یا تو وہ کسی جزئیے میں پھنس جاتا ہے یا وہ مخالف فریق کے نظریے پر اپنے اصولوں کی روشنی میں نقد کر رہا ہوتا ہے۔ یہاں جو تنقید ہوئی، وہ اپنے اپنے اصولوں کے لحاظ سے مضبوط تھی، مگر استاذ گرامی کے اصولوں کے لحاظ سے محل اور درست نہیں تھی۔ مثلاً استاذ گرامی کے نزدیک اسلام کا ماخذ محض قرآن و سنت ہیں۔ تقی عثمانی صاحب جس فقہی روایت کے امین ہیں، وہ اس روایت کو بھی دین کا ماخذ سمجھتے ہیں۔ استاذ گرامی کی نظر میں وہ چیز

اسلامی نہیں ہے جو قرآن و سنت سے ماخوذ نہ ہو، جبکہ تقی عثمانی صاحب کے نزدیک وہ اسلامی ہو سکتی ہے۔ یہی وہ فرق ہے، جو اس تنقیدی گہما گہمی کا باعث ہے۔ اسی طرح شاید عثمانی صاحب ریاست اور حکومت میں فرق نہیں کرتے، حکومت اسلامی اور غیر اسلامی ہوا کرتی ہے، ریاست کبھی بھی اسلامی یا غیر اسلامی نہیں ہوتی۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ آپ کسی محلے یا گلی کو چے کو اسلامی کہنا شروع کر دیں، حالاں کہ وہاں کے باشندے اسلامی یا غیر اسلامی ہوں گے۔ میرے خیال میں صحیح تر نقد وہ ہوگا جو یا مخاطب کے اصولوں پر ہو یا اس کے اصولوں کو ماننے ہوئے اس کی آرا پر ہو، وگرنہ آپ کا نقد غیر مؤثر رہ جاتا ہے، محنت رائگاں چلی جاتی ہے۔ تیسری صورت نقد کی یہ ہو سکتی ہے کہ صرف ان باتوں پر کھڑے ہو کر نقد کیا جائے جو دونوں فریقوں کے مابین مشترک ہوں۔ اسے میں آفاقی نقد کا نام دیتا ہوں۔ اس میں اصول اور آرا کی کوئی حیثیت نہیں رہتی، بلکہ وہ مسلمہ آفاقی اصول ہوتے ہیں جو ہم مذہب و ہم مشرب افراد میں مسلمات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی رائے میں یا کسی نظر پرے میں اگر اس سے انحراف ہو تو آپ یقیناً ایک مفید نقد کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سارے عرصے میں ایسا نقد خال خال ہی نظر آتا ہے۔

دوسری بات: سماج کیا ہے؟ یہ کیسے بدلتا ہے؟ اس کو بدلنے والے کون لوگ ہیں؟ جوابی بیانیے کی اس بحث کا ہدف پاکستان کی سماجی ابتری ہے۔ اس میں پائے جانے والے بیانیے ہیں۔ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سماج کو بنانے والے تین عوامل ہیں: ۱۔ بیانیہ، ۲۔ بیانیے کے حامل افراد اور ۳۔ کارفرما قوتیں۔ بیانیہ دراصل بیانیے کے حامل افراد کے نظریات، مفادات اور دل چسپیوں (interests) کا نام ہے۔ مثلاً علما مذہبی بیانیے کے حامل ہیں۔ جس کے ساتھ ان کے دین و دنیا کے interests وابستہ ہیں، سیکولر بیانیے کے حامل افراد کے interests کی حصولی سیکولر ازم کے قیام و بقا کے مہم ہون منت ہے۔ کارفرما عناصر سے ہماری مراد بزنس کلاس، بیوروکریسی، سیاست دان اور حکمران طبقہ ہیں۔ ان کے مفادات اور interests جس رخ پر بیٹھیں معاشرے میں ان کو ترویج دی جاتی ہے۔ اس کے لیے دونوں طبقات میں سے ہم خیال لوگوں کو برتا جاتا ہے۔ جو معاشرے کو پسندیدہ رخ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے پیچوں بیچ ایک اور طبقہ ہمیشہ کارفرما رہتا ہے۔ وہ ان ذہین افراد کا گروہ ہوتا ہے جس کی نگاہ ان امور پر ہوتی ہے کہ جب ایک بیانیہ معاشرے کے لیے قابل عمل نہ رہے یا وہ خرابی کا باعث بن رہا ہو، تو وہ افراد متبادل بیانیے دینے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے معاشرہ پھر سے اپنی ڈگر پر چل پڑتا ہے۔ فساد رفع ہو جاتا ہے اور نئی راہیں کھل جاتی ہیں۔ استاذ گرامی کے خیال میں روایتی بیانیہ اپنے اسی مقام پر پہنچ چکا ہے کہ اب ایک نئے بیانیے کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں، ان کے نزدیک روایتی بیانیہ نہ صرف اگلے دور کے لیے ناقابل عمل ہے، بلکہ وہ اس ملک میں

فساد کا باعث بھی ہے۔ اس لیے اب ضرورت ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں نیا بیانیہ ملک کو دیا جائے۔

ایسا کرنے سے متعدد بیانیے وجود میں آ جاتے ہیں، لیکن قوت ہمیشہ زیر عمل بیانیے کے پاس ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کے حاملین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایک چیز اور عمل میں آ جاتی ہے کہ یہ متعدد بیانیے اپنے اپنے حاملین پیدا کر لیتے ہیں، جس سے معاشرے میں نیا خون آہستہ آہستہ سرایت کرنے لگتا ہے۔ کچھ لوگ نئے بیانیے میں ملک و قوم کے لیے نجات محسوس کرتے ہوئے اسے اپنا لیتے ہیں، اور کچھ روایتی بیانیے کو ایسا ہی خیال کرتے ہوئے اسے اپنا لے رکھتے ہیں۔ لیکن نئے بیانیے اپنا ایک کام خاموشی سے کرتے رہتے ہیں۔ روایتی بیانیے والے مرور وقت کے ساتھ اپنے ہاں جزوی تبدیلیاں لاتے جاتے ہیں، اور نئے بیانیے کو جزو اجزؤ قبول کرتے کرتے پورے بدل جاتے ہیں۔ کبھی ایک ہی نسل میں اور کبھی اگلی کئی نسلوں میں۔ اور نئے بیانیے کو اپنانے والے معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے روایتی بیانیے کی کچھ چیزوں کو اپنا لے رکھتے ہیں۔ بول ترک و قبول کی کڑیاں اگلی کڑیوں سے مسلسل جڑتی جاتی ہیں اور چند ہائیوں ہی میں غیر محسوس طریقے سے نیا سماج وجود میں آ چکا ہوتا ہے۔ اپنے ملک کی چند ہائیوں کا جائزہ لیجیے: تصویر کی حرمت کے قائل علما نے ٹی وی کی تصویر کو حلال کیا ہے، اور اس کے ہر چینل پر زینت افروز نظر آتے ہیں۔ بعض علما نے چٹلون پہننی شروع کر دی ہے، ٹی وی جس کی حرمت کے فتوے تھے، ہر مذہبی و غیر مذہبی کے گھر کی زینت ہے۔ فلم جسے کبھی عام شرفا بھی چھپ کر دیکھتے تھے، اب بہت سے علما بھی بلا خوفِ عوام دیکھتے ہیں۔ جان جس کی حرمت سب سے بڑھ کر تھی، اس کی بے حرمتی کا قبیح منظر ہمارے سامنے ہے۔ پردہ جو اس معاشرے کا نہایت نمایاں مظہر تھا، وہ کم لباسی کا رخ اختیار کر چکا ہے۔ دائیں ہاتھ سے نوالہ توڑ کر کھانا ایک تہذیبی عنصر تھا، اب دونوں ہاتھ سے پکڑ کر نوچ نوچ کر کھانا نئی تہذیب کا پسندیدہ طرز ہے۔ کوئی بیانیہ ان تبدیلیوں کو نہیں روک سکا۔ مثلاً تصویر کی حرمت کا کوئی فتویٰ، نہ کیمروں کی خرید و فروخت پر اثر انداز ہوا ہے اور نہ تصویر کشی کے فن پر، اس لیے کہ اس روایتی بیانیے میں جان نہیں رہی، کچھ ہماری کوتاہ بیانی سے اور کچھ مغرب کی ریشہ دوانی سے۔

استاذ گرامی نے جو بیانیہ دیا ہے، وہ نوشتہ دیوار ہے۔ اسے جس قدر چاہے نقد سے اڑا دیں، وہ اپنا خاموش عمل شروع کر چکا ہے۔ یہ تاریخ کا جبر ہے، یونہی ہوتا آیا ہے، ہوتا رہے گا۔ اس بیانیے کو سننے والے پریشان نہ ہوں، یہ بیانیہ اتنا ہی اپنایا جائے گا، جتنا کارفرما عناصر کو قابل قبول ہوگا۔ اس کے باقی اجزائے اٹھنی اور ارق کی زینت بنے تاریخ کا حصہ بن جائیں گے۔ استاذ گرامی کے بیانیے کے حاملین کو صبر سے کام لینا ہوگا، ان کا بیانیہ اتنی جلدی نہیں اپنایا جائے گا۔ اس کے لیے دہائیوں اور بعض اوقات صدیوں کا وقت بھی لگ جاتا ہے، اس لیے کہ آج روایتی بیانیہ کا دور دورہ

ہے۔ وہ اگرچہ زوال پذیر ہے، مگر ہاتھی گرتے گرتے بھی وقت لیتا ہے۔ اس کو تاریخ کے آئینے میں دیکھیے: معتزلہ کو دین سے خارج کیا گیا، آج تمام اشعری بہت سے معتزلی نظریات کے حامل ہیں۔ ابن تیمیہ کو زندیق و فتنہ کہا گیا، آج ان کا تصور حدیث اور تعبیر دین احناف و شوافع کا نظریہ و مسلک ہے۔ ابن حزم ظاہری کو بے استادہ اور نکما کہا گیا، آج حنبلی فقہ اس کی اسیر ہے، اور احناف و شوافع بھی اثر پذیری سے محفوظ نہیں ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم نے چند دہائیاں قبل ایک بیانیہ دیا تھا، جو اس وقت نیا تھا، مگر آج وہی ہر عالم دین کا بیانیہ ہے۔ لیکن یہ تمام اثرات خاموشی سے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ ہاں اکا دکا لوگ علانیہ بھی بیانیہ تبدیل کرتے (یہ جرأت رندانہ خال خال نظر آتی ہے) اور ان میں سے بعض پھر اسے ترک کر دیتے ہیں۔

تیسری بات: کیا روایتی بیانیہ دینی بیانیہ ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ یہ بیانیہ تو روایتی بھی نہیں ہے۔ میرے خیال میں اسے روایتی نہیں، بلکہ contemporary narrative کہنا چاہیے۔ یہ بھی عہد استعمار میں مابعد اقبال پیدا ہوا ہے۔ ہم شاعر مشرق کے بیانیہ کے حامل ہیں، نہ کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ علامہ اقبال نے اس مایوسی کی فضا، جو سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد مسلمانوں میں موجود تھی، کو ختم کرنے کے لیے ایک انقلابی بیانیہ دیا تھا، جسے بعد میں سیاسی و عملی میدان میں مودودی صاحب اور فکری میدان میں بہت سے اصحاب علم نے آگے بڑھایا تھا۔ اس بیانیے کے پیچھے جمال الدین افغانی، سرسید، قاسم نانوتوی، شبلی اور اقبال وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ آج کا بیانیہ ان کا تشکیل کردہ ہے۔ ہم رجال و نجیب رجال۔ اس بیانیے کو قرآن و سنت کی سند حاصل نہیں ہے۔ وہ بات جو علما مانتے ہوں، وہ لازم نہیں کہ دینی طور پر درست بھی ہو۔ مثلاً زمین ساکن ہونے کا نظریہ علما کا نظریہ تھا، تو آیا یہ نظریہ دینی ہو گا؟ یقیناً نہیں۔ بلاشبہ، اس بات کا امکان ہے کہ اس طرح کے امور میں، جہاں نصوص خاموش ہوتے ہیں، کسی صاحب علم کی رائے عین قرآن و سنت کے مطابق ہو۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کا امکان ہے کہ اس کی بات محض اس کی اپنی رائے ہو۔ کم از کم ہمارے موجودہ بیانیے کی یہی حقیقت ہے۔

یہ بات واضح ذہنی چاہیے کہ بیانیہ کیسا بھی ہو، جب وہ ذہنوں میں تسلیم شدہ حالت میں موجود ہو تو نصوص قرآنی بھی ویسی ہی دکھائی دینے لگ جاتی ہیں۔ ان کے معنی بیانیہ کی روشنی میں ذہن تک پہنچتے ہیں۔ مثلاً مولانا مودودی کی تفسیر قرآن اس انقلابی بیانیہ کی روشنی میں لکھی گئی ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح نصوص اس تفسیر میں اپنا رخ بدلتے جاتے ہیں۔ اس لیے اس بات کا پورا امکان ہے کہ ہم جس بیانیے کو قرآنی کہہ رہے ہوں، وہ محض ہمارا حسن نظر ہو۔ لہذا نئی بات کو سمجھنے کی کوشش کرنی ہوگی، محض یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ یہ بات نئی ہے یا یہ بات علما کے نزدیک غلط

ہے۔ زمین ساکن ہے، کو اگر ہم صرف اس وجہ سے مانتے رہیں کہ یہ ہمارے روایتی علما کا نظریہ تھا، تو یہ دراصل حقائق کا انکار کرنے کے مترادف ہوگا:

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزلِ یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

